Cosmos Multidisciplinary Research E-Journal — Online Available at www.cmrj.in
Recognized International Peer Reviewed Journal — Impact Factor 4.94 — ISSN No. 2456-1665

عبدالماجد دریاآبادی کی کالم نویسی

Abdul Majid Daryabadi's Column writing

By

Dr. Ansari Masood Akhtar Jamal Ahmed

Asst. Professor & Head Dept. of Urdu

MSS's Ankushrao Tope College, Jalna (M.S.)

مقالہ نگار : ڈاکٹر انصاری مسعود اختر جمال احمد

اسسٹنٹ پروفیسر وصدر شعبۂ اُردو

انکوش راؤٹوپے کالج، جالنہ (مہاراشٹر)

Abstract:

The article offers a brief study of Abdul Majid Dariyabadi's column writing. He has been a lifelong advocate of journalism. He was only in the twelfth year of his life and wrote an article from the pen of a seventh grade student and it will be published in the newspaper. As the age progressed towards the goal of the age, the maturity of the pen also came, finally, in August 1925, Mant permanently brought out its weekly paper "Sach", in addition to its academic, literary, reformative and journalistic content, it was a permanent journal. The column "Sachi Baat" was also kept, which was a new, unique and interesting style in today's journalism, it ran and ran well. Abdul Majid's writing skills and critical skills were also found to be of a high level, apart from this, he used to write short words on the current situation and past events. "Sach" will be closed after nine years and a few months, and then after some interval, "Sidq" and "Sidq-e-Jadid", which was the second and intermediate form of Sach, continued as long as Abdul Majid was alive.

Apart from the "Sachi Batein", he had another permanent column titled "Advices and Requests". In it, the religious and spiritual forms arising from the developments of the present era were answered. Abdul Majid used to give authoritative and charming answers to many such questions in this column, because he himself had gone through the torment of wisdom. He was a unique and highly respected journalist who was associated with the editorship of the three weekly magazines for more than half a century and established very bright and brilliant trends in journalism. Even as a columnist and journalist, he proved to be the most distinguished journalist by principle. In post-Partition India, it can be said without a doubt that no other Urdu journalist could write such a pen and such a domineering tone. He works with simplicity and smoothness in his literary and journalistic writings. Beneath his nape, small sentences, prominent phrases, idioms, poems and stanzas, flowing words while speaking techniques. Then how can you say that words cannot be removed from where they have been placed. Like a gem in a ring, it shines in its place.

Keywords: Abdul Majid Dariyabadi, column writing, journalism, "Sach", "Sidq" and "Sidq-e-Jadid",,"Sachi Batein", post-Partition, "Truth", Urdu, Journalist.

مشہور ادیب و انشاء پرداز عبدالماجد دریا آبادی، وہ منفرد اور جلیل القدر صحافی تھے جو نصف صدی سے زائد عرصہ تک تین ہفتہ واروں "سچ"، "صدق" اور "صدقِ جدید" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے منسلک رہے اور صحافت میں بڑی درخشاں اور تابناک روایتیں قائم کیں اور بحیثیت صحافی انہوں نے ایک بااصول ممتاز ترین صحافی ہونے کالوہامنوالیا۔ مذہب، وطنیت اور صحافت کے بارے میں وہ ایک خاص نقطۂ نظر رکھتے تھے اور ان کے اخباروں میں اسی نقطۂ نگاہ اور مسلک کی ترجمانی ہوتی تھی۔

صحافت کہنا چاہئے کہ عبدالماجد کا پیدائشی میدان رہاہے، اور زندگی بھر کا اوڑھنا بچھونا۔ ابھی عمر کی گیارہویں سیڑھی ہی پر قدم رکھ پائے تھے اور ساتویں جماعت کے طالب علم، کہ علی گڑھ کے جدت پسند طبقہ کی طرف سے مسائل اسلام کی ترمیم کی تائید میں ایک مضمون نکلا، غیرتِ ایمانی سے بیتاب ہو کر اس کا رَدّ ایک فرضی نام سے لکھ بھیجا اور وہ چھپ بھی گیا، اس کا ذکر عبدالماجد نے اپنی آپ بیتی ص 205 پر مفصلاً کیاہے۔ گویا عبدالماجد نے اپنی بے قاعدہ صحافیانہ زندگی کا آغاز 1940ء میں اس مراسلے سے کرلیا جو "اودھ اخبار" میں شائع ہوا تھا جب کہ وہ ابھی تقریباً بارہ برس ہی کے تھے۔ جوں جوں اُن کے قلم میں قوت اور روانی آتی گئی، ان کی تحریروں کی اشاعت کا دائرہ بھی پھیلتا گیا چنانچہ ان کے علمی، ادبی، مذہبی مضامین "ضیاء الاسلام"، "العصر"، "صبحِ امید"، "حقیقت"، "معارف"، "ہمدم" اور "ہمدرد" وغیرہ میں شائع ہونے لگے۔

اُن کی اُردو صحافت کی مدت کار نصف صدی سے زائد عرصہ پر محیط ہے۔ عبدالماجد نے بالخصوص اُردو کے تین ہفتہ وار "سچ" (9 سال)، "صدق" (16 سال) اور "صدقِ جدید" (26سال) خود ہی نکالے۔ ان تینوں پرچوں کی مزید تفصیلات عبدالعلیم قدوائی نے اپنی مرتب کردہ کتاب "عبدالماجد دریابادی: حیات وخدمات" میں ضمیمۂ دوم (ہفتہ وار اخبارات کی تفصیل و مشمولات کی ترتیب) ص127۔174 کے تحت درج کی ہیں۔

اس دَور میں عبدالماجد نے خود کو محض اُردو مضمون نگاری ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ انگریزی میں بھی مضامین اور تبصرے لکھنے لگے جو"آئی ڈی ٹی"،"ایڈوکیٹ"،"نیچر"،"سیٹرڈے ریویو"،"ماڈرن ریویو"،"انڈین ریویو"،"تھیوسوفسٹ"اور"ایسٹ اینڈ ویسٹ"میں شائع ہوتے رہے۔

1919ء کے آس پاس عبدالماجد نے سب سے پہلے "معارف" میں مستقل شذرہ نگاری کا آغاز کیا۔ان شذرات کے موضوعات ادبی اور علمی بھی ہوتے تھے اور سیاسی اور سماجی بھی۔یہ شذرات ان کی "سچی باتیں" ، جو"سچ"،"صدق"اور"صدقِ جدید"کا مستقل عنوان ہوا کرتی تھی اور جنھیں ہندوپاک کے بیشتر اخبارات اور رسائل نقل کیا کرتے تھے،ان کے پیش رَو کہے جاسکتے ہیں۔ان میں بھی وہی حکمت، مغرب کے معاملے میں عدم اعتماد،نکتہ آفرینی اور عبرت آگینی ہوتی تھی جو سچی باتوں کا طرۂ امتیاز تھا۔سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اخلاقی سطح پر ہونے والے واقعات ان شذرات کے لیے غذا مہیا کرتے تھے۔ان شذرات میں اُردو کی حمایت اور حق میں آواز رسانی کا بھی جذبہ نظر آتا ہے جو تقسیم ملک کے بعد عبدالماجد کے یہاں ایک مشن اور ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ان شذرات میں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

"انجمن ترقی اُردو سے یہ دوستانہ گلہ ہمیشہ رہا اور اب بھی ہے کہ وہ تحفظِ اُردو کی مطلق کوشش نہیں کرتی۔اُردو میں اعلیٰ مطبوعات کی تالیف وترجمہ کی اہمیت میں کس کو کلام ہوسکتا ہے لیکن اس کی بقا وقیام کی تدابیر اس کی ترقی کی تدابیر پر مقدم ہیں۔اگر اُردو کا وجود ہی باقی نہ رہا تو یہ کتابیں کس کام آئیں گی۔یہ کام اگر اس کے فرائض اعلیٰ میں داخل نہیں تو اس کے لیے ایک جداگانہ جماعت کو تیار ہونا چاہیے۔" 1

انہی شذرات میں ایک جگہ ہندوستان کے سائنسدانوں پی سی رائے اور سرجے سی بوس کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے انکشافات کی داد دینے کے بعد لکھا گیا ہے:

"کاش اہلِ مغرب سمجھیں کہ مشرق نے جن علوم میں ان کی شاگردی کی ہے،ان میں ہمیشہ ان کی حیثیت محض شاگردانہ نہیں رہ سکتی۔" 2

ان شذرات میں کہیں جنگ عظیم اول کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاشی بحران اور نتیجتاً علمی بحران کا ذکر ہے، کہیں جدید طبی، علمی اور سائنسی تحقیقات کا ذکر ہے اور کہیں صوبے اور ملک کی تعلیمی پستی کو دور کرنے کے سلسلے میں حکمت افروز تجاویز دی گئی ہیں۔صوبہ اودھ کے تعلیمی بجٹ کا تقابل انگلستان وویلز کی مجموعی آبادی کے لیے(بہ سلسلۂ تعلیم) مختص بجٹ سے کیا گیا ہے اور آخر میں یہ حکیمانہ جملہ لکھا گیا ہے:

"اپنی پست قامتی کا احساس کرنا ہے تو کسی دیو ہیکل کے پہلو میں کھڑے ہوجانا چاہیے۔" 3

1922ء میں عبدالماجد نے اس پرچے میں مثنوی"فیہ مافیہ" کے زیرِ عنوان شذرات لکھنا شروع کیے جو 1924ء تک جاری رہے۔یہ شذرات عبدالماجد نے اپنے نام سے لکھنے کی بجائے ایک قلمی نام"خامۂ اثر چلّی" کے زیرِ نقاب لکھے۔یہاں بھی ان کے ہاں وہ رنگ غالب ہے جو بعد ازاں ان کی مستقل پہچان بن گیا۔وہ جہاں کہیں کجی، منافقت یا شر وفساد دیکھتے ہیں یا انہیں یقین ہوتا ہے کہ اس خاص واقعہ یا مظہر کے کوئی منفی اثرات مرتب ہوسکتے ہیں،وہیں اس صورتِ حال کے خلاف صف آرا ہوجاتے ہیں۔خصوصاً ایسے افراد یا ادارے ان کے طنز وتنقید کا نشانہ بنتے ہیں جن سے توقع خیر اور بھلائی کی ہوتی ہے لیکن ان سے عبدالماجد کی دانست میں صدور شر یا منفیت کا ہوتا ہے۔اس ضمن میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہو یا جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، ڈاکٹر ذاکر حسین ہوں یا ابوالاعلیٰ مودودی کوئی بھی ان کی طنز وتنقید سے بچ نہیں سکتا۔

ہفت روزہ "الناظر" (لکھنؤ) کے ایڈیٹر ظفر الملک کے ساتھ اسی دوستی اور قلمی تعاون کا نتیجہ تھا کہ دونوں نے "سچ" (ہفت روزہ) کا ڈول ڈالا اور جنوری 1925ء میں سچ کا پہلا شمارہ منصۂ ظہور پر آیا۔ابتدا میں اس پرچے کے ایڈیٹر ظفر الملک تھے لیکن اگست 1925ء میں عبدالماجد اس کے ایڈیٹر بن گئے اور ظفر الملک اس کے منیجر۔"سچ" کی پیشانی پر ایک فارسی شعر مستقل درج ہوتا تھا: 4

راستی موجبِ رضائے خداست کس ندیدم کہ گم شد از رہِ راست سعدیؔ

کچھ عرصے کے بعد یہ آیت قرآنی بھی پہلے صفحے پر درج ہونے لگی:

"والذی جآء بالصدق وصدق بہ، اولٰئک ھم المتقون۔"

یہ شمارہ لکھنؤ سے ہر جمعہ کو نکلتا تھا۔"سچ" کا تخیل عبدالماجد یا اُن کے دوستوں کے ذہن میں کیسے پیدا ہوا،اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عبدالقدوس ہاشمی لکھتے ہیں :

"اخبار"سچ" نکالنے کا خیال اس طرح پیدا ہوا تھا کہ انگریزوں میں ایک اخبار"ٹروتھ" کے نام سے نکلتا ہے۔...مَیں جس زمانے میں شہر گیا کے رسالے"ندیم" کا ایڈیٹر تھا تو بڑی پابندی کے ساتھ یہ اخبار لندن سے منگواتا اور پڑھتا تھا۔اخبار"ٹروتھ" ویسے تو بظاہر ایک مجموعۂ افکار بلکہ بڑی حد تک تحقیقی مضامین کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت وہ بگڑی ہوئی عیسائیت کا منادی ہے۔اس اخبار کو دیکھ کر شاید ان کے ذہن میں آیا کہ اس طرح کا ہفتہ وار اُردو میں شائع کیا جائے۔" 5

"سچ" کا آغاز جنوری 1925ء سے ہوا اور اس کے دوسرے ہی نمبر سے عبدالماجد نے اس میں "سچی باتیں" کے عنوان سے ایک مستقل کالم کا آغاز کیا جس کا سلسلہ ان کی وفات سے چند ماہ پہلے تک جاری رہا اور جو اپریل 1985ء (یہ تاریخ"صدق جدید" کی بندش کی ہے، حکیم عبدالقوی نے خرابیِ صحت کی بنا پر اس کی اشاعت بند

کر دی) دوبارہ "صدق" اور "سچ" کے پرانے شماروں سے برابر نقل ہوتی رہیں۔ عبدالماجد کی قرآن و سنت سے وابستگی اور اسلام سے والہانہ عقیدت وہ چیز ہے جن سے "سچ" کے کم و بیش سارے مشمولات ترتیب پاتے تھے۔ یکم جنوری 1926ء کی "سچی باتیں" کا ایک مختصر اقتباس درج کیا گیا ہے جس میں عبدالماجد نے اس بات پر تعجب اور تاسف کا اظہار کیا ہے کہ جو باتیں مسلمات اور یقینیات میں سے تھیں، اب ان پر بھی متفقہ تجاویز منظور کی جانے لگی ہیں جیسے لڑکیوں کے شرعی ترکہ کا مسئلہ، عبدالماجد ندوہ کے سالانہ جلسے میں اس تجویز کی منظوری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "کیا یہ شریعت کا کوئی اختلافی مسئلہ ہے، کیا اس میں بھی سنی و شافعی، مقلد و غیر مقلد، صوفی و وہابی، اہل حدیث و اہل قرآن کی راہیں جدا جدا ہیں۔ کیا کسی گروہِ علماء کے نزدیک لڑکیوں کا حصۂ شرعی ثابت ہے اور کسی کے نزدیک نہیں بھی؟" 6

"سچ" میں شامل ایسی باتوں سے یہ قیاس نہ کیا جائے کہ اس میں بس یہی کچھ ہوتا تھا۔ عبدالماجد محض فقہ و نقل کے مباحث ہی کو یہاں درج کرتے اور ان سے نتائج مرتب نہیں کرتے بلکہ فطرت و مناظرِ فطرت سے بھی حکمت کی کشید کا سامان مہیا کرتے تھے۔ ذیل میں "سچی باتیں" کا ایک اَور اقتباس ملاحظہ ہو جس میں خالقِ سماوات کی برکات کو تخلیقی انداز میں اُجاگر کیا گیا ہے:

> "زمین خشک، مردہ و بے جان پڑی ہوتی ہے۔ جب آسمان سے پانی برستا ہے۔ اسی وقت ہر طرف تازگی و شادابی پھیل جاتی ہے، سبزہ لہلہانے لگتا ہے۔ پھول کھلنے لگتے ہیں اور ذرہ ذرہ میں گویا جان پڑ جاتی ہے، زمین میں تاریکی چھائی ہوتی ہے، ہر چیز اندھیرے کے حجاب میں لپٹی ہوتی ہے جب آسمان پر طلوعِ آفتاب ہوتا ہے اور اس کی کرنیں زمین پر پہنچتی ہیں تو ہر شے روشن ہو جاتی ہے۔ ہر طرف نور پھیل جاتا ہے۔ کوئی چیز چھپی ہوئی یا دُھندلی نہیں رہ جاتی اور ذرہ ذرہ جگمگانے لگتا ہے۔ آفتاب جب چھپ جاتا ہے تو زمین پھر بے نور ہو جاتی ہے اور سارا منظر بے روپ، بھیانک اور بے رونق ہو جاتا ہے۔ جب آسمان پر چاند اور تارے طلوع ہوتے ہیں تو یہ بدمنظری پھر دور ہو جاتی ہے... درخت جب خشک ہو جاتے ہیں، سبزہ جل جاتا ہے، زمین جب پیاسی ہو کر تپنے لگتی ہے، دریاؤں کے لبوں پر جب پپڑیاں جم جاتی ہیں تو آسمان ہی کی بارش اپنے فیض و کرم سے ان سب کو سیراب، سب کو تروتازہ اور سب کو شاداب کر دیتی ہے۔ اگر آسمان کی دستگیری قدم قدم پر سہارا نہ دے دیتی رہتی تو آج نہ زمین موجود ہوتی نہ زمین کی دلچسپیاں اور خوش نمائیاں، نہ زینتیں اور رونقیں، نہ آرائشیں نہ آسائشیں۔" 7

توحید بیانی کا یہ پیرایہ جس قدر موثر ہے، اس کا اندازہ ہر شخص بآسانی کر سکتا ہے۔

عبدالماجد نے اپنی باون سالہ صحافتی زندگی میں بے شمار قلمی لڑائیاں لڑیں۔ ذیل میں اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے، یہ بات البتہ ابتدا ہی سے ذہن نشین رہے کہ یہ لڑائیاں سوائے ایک استثناء کے، کسی ذاتی یا نفسانی غرض کے لیے نہیں بلکہ حق کو حق کی شکل میں دیکھنے اور دکھانے کے لیے تھیں۔ یہ ضرور ہے کہ اپنے بعض معاصرین کے بارے میں عبدالماجد کا لہجہ ضرور سخت ہو گیا ہے جو نتیجہ ہے ان کی طبعی زُود رنجی اور غصہ پن کا۔ لیکن اس میں ان کی ہوائے نفسی کو دخل نہ تھا البتہ جس ایک استثناء کا ابھی ذکر ہوا ہے، وہ ان کا مولانا ابوالکلام آزادؔ سے ادبی معرکہ ہے جس کے بارے میں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مناقشہ محض انگریزی کے دو لفظ کے اُردو ترجمہ یا اصطلاح کے سلسلے میں تھا، ہوا یہ کہ عبدالماجد نے اپنی کتاب "فلسفۂ جذبات" میں مفرداتِ جذبات کے باب میں Pain and Pleasure کا اُردو ترجمہ "حظّ و کرب" کیا تھا... اور یہی مضمون ابوالکلام آزادؔ کے "الہلال" کی 18، اور 25 جون 1931ء کی دو اشاعتوں میں شائع ہوا تھا، مولانا آزادؔ نے اس مضمون کے آخر میں ایک ادارتی نوٹ تحریر کیا اور لکھا کہ "حظّ" عربی میں "حصے" کے معنی میں مستعمل ہے اور Pleasure کے سلسلے میں موزوں اصطلاح نہیں ہے بلکہ "حظ و کرب" کی "بجائے لذت و الم" ترجمہ کرنا زیادہ صحیح ہو گا، اس پر ایک طویل علمی و لسانی بحث چھڑ گئی جو ادبی اور خاص طور پر روزمرہ سے تعلق رکھتی تھی۔ عبدالماجد نے اپنے موقف پر اصرار کیا اور دلائل پیش کیے، البتہ اس بحث کا جو ایک بڑا فائدہ ہوا اور جس کی اہمیت آج بھی مسلّم ہے، وہ لغت اور اس کے اشتقاقات کے ضمن میں بڑے بصیرت افروز نکات کے سامنے آجانے کا تھا، خصوصاً ابوالکلام کا اُردو کی متداول اور مسلّمہ طور پر مستند لغات مثلاً فرہنگِ آصفیہ کے سلسلے میں عدم اطمینان بجائے خود ایک لمحۂ فکریہ تھا۔ پھر ابوالکلام کا یہ کہنا کہ کسی زبان کے صحیح مزاج شناس اس زبان کے بولنے اور جاننے والے ہوتے ہیں نہ کہ وہ انگریز مثلاً پامر وغیرہ۔ جنھوں نے اُردو لغات پر کام تو کیا ہے لیکن جو اس درجہ قابل اعتنا نہیں۔ چونکہ یہ زمانہ عبدالماجد کی مذہب بیزاری کا تھا اس لئے بحث کے دوران ذاتیات پر حملے ہونے لگے اور اس بحث میں کچھ تلخی اور ناخوشگواری پیدا ہو گئی۔ اس بحث کا ذکر مفصل ذکر ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری نے اپنے مضمون "مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا آزاد کے ادبی معرکے" 17 میں بھی کیا ہے لیکن اسے غیر واضح کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کیوں کہ انھوں نے عبدالماجد پر فکر کے عدم توازن کا الزام لگایا ہے اور اس کا ثبوت یہ دیا ہے کہ ایک طرف تو عبدالماجد حریتِ فکر اور مذہبی رواداری کے اس قدر علم بردار بنتے ہیں کہ منکرین مقامِ ختمِ نبوت تک کو دائرہ اسلام سے باہر چھوڑنا گوارا نہ کیا اور دوسری جانب مولانا آزاد کو خدا کی بخشش و رحمت سے محروم کر دیا۔ ڈاکٹر ابوسلمان کی اس عدم واقفیت یا غیر وضاحتی بات کو سمجھنے کے لیے عبدالماجد کی زندگی کے نشیب و فراز اور آخر عمر میں ختمِ نبوت کے منکرین کے بارے میں اپنے موقف سے رجوع کا مطالعہ کرنا کافی ہے۔ اس ادبی مناقشہ کا ذکر کرنے کے بعد ڈاکٹر عبدالعلیم قدوائی اپنی کتاب "عبدالماجد دریابادی حیات و خدمات" میں لکھتے ہیں کہ:

> ”لیکن فریقین کے دلائل کی روشنی میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ چار پانچ سال کے بعد مولانا (آزاد) کی رانچی کی جیل میں نظر بندی کے دوران خط و کتابت سے یہ تلخی دور ہو گئی اور پھر دونوں اکابرین میں آخر دم تک شگفتہ اور دوستانہ تعلقات رہے۔ جن لوگوں نے اس بحث کی بنا پر مولانا دریابادی کو مولانا آزاد کا معاندیا دشمن قرار دیا ہے وہ سراسر غلطی پر ہیں۔“ 8

عبد الماجد کے علمی و ادبی مباحث اور مناقشات کے ضمن میں عبد الماجد کے طریقِ کار کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ عبد الماجد جب کسی کتاب یا فرد کے خلاف لکھنا شروع کرتے تھے تو پھر اس مسئلے کو اپنے اوپر طاری کر لیتے تھے اور جب اسے اس کے منطقی انجام تک پہنچا نہیں لیتے تھے، دم نہیں لیتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود عبد الماجد نے ایک موقع پر اپنے ایسے حریف کو (جو اُن کے نزدیک ملت کا مجرم ہے) پچھاڑنے کے لیے اپنے طریقِ کار کی وضاحت کر دی تھی، لکھتے ہیں :

> ” میری صحافتی Strategy (جنگی تدبیر) کو بھی اس سلسلے میں یاد رکھ لیا جائے۔ میں ملت کے مجرم کو زیادہ سے زیادہ isolate (یکہ و تنہا) کر لینا چاہتا ہوں، صرف مشتبہ یا خفیف قصور والوں کو اس سے الگ رکھنا چاہتا ہوں کہ مجرموں کو دوسروں کی آڑ اور سہارا لینے کا موقع کم سے کم مل سکے۔ باقی تمام کمزوریوں سے بلند تر رہنے کا دعویٰ اپنے حق میں کیسے کر سکتا ہوں؟“ 9

عبد الماجد کے نزدیک صحافت کا سب سے بڑا مقصد خدمتِ دین و ملت تھا۔ ”سچ“، ”صدق“ اور ”صدقِ جدید“ کے مشمولات اسی ایک مقصد سے پھوٹتے تھے۔ چنانچہ ”صدق“ کے حاوی مشمولات میں تفسیرِ قرآنی، مشورے اور گزارشیں (روحانی، اخلاقی و دینی اُلجھنوں کے حل کرنے کے سلسلے میں) اور ”سچی باتیں“ تقریباً مستقل عنوانات تھے۔ وقت کے جاری و ساری فتنوں پر تبصروں کے لیے عبد الماجد کا مستقل کالم ”سچی باتیں“ جس قدر مقبول ہوا، اس کی کوئی مثال بیسویں صدی کی اُردو صحافت میں کم ملے گی۔ سچی باتوں کا آغاز، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، ”سچ“ کے اجراء سے ایک ماہ بعد ہی ہو گیا تھا۔ ”سچ“ اور اس کے مشمولات کس قدر مقبول تھے۔ اس کا اندازہ لگانے کے لیے ”سچ“ ہی کا ایک شذرہ قابلِ مطالعہ ہے :

> ”سچ کے مضامین کو اس کے معاصرین بحمد اللہ جس کثرت سے اپنے صفحات میں جگہ دیتے رہتے ہیں، اس کا ذکر ایک سے زائد بار ہو چکا ہے... اللہ کے فضل و کرم سے دوسرے طریقوں سے بھی سچ کا پیام دوسرے بھائیوں تک پہنچتا رہتا ہے، چنانچہ پچھلے سال (1926ء) دکن اور میسور جیسے دور دراز علاقوں تک سے اس کی اطلاعیں موصول ہوئی تھیں کہ اس کے بعض مضامین مسجدوں میں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں، ان کی نقلیں مسجدوں میں چسپاں کر دی جاتی ہیں... اسی طرح بمبئی سے ایک نادیدہ کرم فرما اپنے تازہ مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: خاکسار نے کچھ روز سے سچ کی سچی باتوں کا ترجمہ گجراتی زبان میں کر کے اخبار 'انصاف' (ہفتہ وار) میں دینا شروع کیا ہے، بعض احباب کی رائے ہے کہ ترجمہ کرنے کی اجازت لے لی جائے۔“ 10

اگر یہ کہا جائے تو بجا ہو گا کہ عبد الماجد نے ”سچ“ کا نام محض لندن کے "Truth" کی نقالی میں نہیں رکھ لیا تھا بلکہ اس کے پیچھے ان کا صداقت شعار تصورِ صحافت کارفرما تھا۔ جس طرح سچ کی پیشانی پر درج شعر عبد الماجد کی صحافتی تحریروں کا طغرا تھا، اسی طرح جب 1935ء میں ”صدق“ کا اجراء ہوا تو اب قرآن حکیم کی یہ آیت اس کا سرِ عنوان بنی: وَالَّذِی جَآءَ بِالصِّدقِ وَصَدَّقَ بِہٖ، اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ O (ترجمہ: اور وہ جو سچی بات لے کر آیا اور جس نے اس کو سچا مانا وہی لوگ پرہیز گار ہیں،) اپنی صحافتی زندگی میں عبد الماجد کا ہمیشہ اس آیت پر عمل رہا چنانچہ تقسیمِ ملک کے فوراً بعد جب ملک کی اکثریت میں احساسِ برتری پیدا ہو گیا اور نام نہاد سیکولر حکومت انھیں دھمکانے لگی تو اس کے مقابل آواز بلند کرنے والوں میں عبد الماجد سابقون الاولون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر جب ملک کے طول و عرض میں بولی جانے والی اُردو کو ملک سے دیس نکالا دیا جانے لگا۔ حتیٰ کہ اُردو بولنے والے ہندوؤں کا شمار بھی ہندی بولنے والوں میں کیا جانے لگا تو اس پر بھی عبد الماجد وقتاً فوقتاً ”حاکمانِ ذی جاہ“ کو جھنجھوڑتے رہے چنانچہ کہیں وہ آنند نرائن ملّا جیسے لوگوں کی صاف گوئی اور ان کے احتجاج کو اپنے پرچے میں جگہ دیتے رہے اور بتاتے رہے کہ مردم شماری کرنے والوں نے ان کا نام ہندی بولنے والوں میں محض اس لیے لکھ دیا تھا کہ وہ ہندو ہیں اور اُنھیں ہندی کٹوا کر مادری زبان اُردو لکھوانا پڑی تھی۔

تینوں ہفت روزہ میں شائع ”سچی باتیں“ میں سے منتخب شذرات کتابی شکل میں ”سچی باتوں کا ایک انتخاب“ کے نام سے صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ کے مہتمم حافظ نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی شائع کر چکے ہیں۔ اگر تمام جلدوں سے ”سچی باتیں“ یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع ہو جائے تو اردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہو گا۔ سچی باتوں کے علاوہ ”صدق“ میں عبد الماجد نے ایک اور مستقل کالم ”مشورے اور گزارشیں“ کے عنوان سے قائم کیا تھا۔ اس میں عہدِ حاضر کے تیز رَو تغیرات سے پیدا ہونے والے مذہبی و روحانی اشکال کے جواب دیے جاتے تھے۔ یہ کام بھی دینی اور نفسِ دین کی حمایت و قوت کا باعث بنا۔ عبد الماجد اس کالم میں ایسے متعدد سوالات کے حکیمانہ اور دلکش جوابات دیا کرتے تھے کیوں کہ وہ خود عذابِ دانشِ حاضر سے گزر چکے تھے، اس لیے جانتے تھے کہ جدید ذہن کی تشفی و تسکین کی کیا موزوں ترین اور حکیمانہ صورت ہو سکتی ہے، مثلاً ایک پڑھے لکھے شخص کے اس سوال کا کہ کیا مسلم دینیات میں نجات کا تصور سراسر مسیحی ہے؟ عبد الماجد نے جو جواب لکھا، وہ ان کی وسعتِ مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان کی حکیمانہ نظر پر بھی دال ہے اور اس حقیقت پر شاہد کہ قرآن کی صحیح اور سیدھی تعبیر ہی اصل تعبیر ہے نہ کہ شاعرانہ، فلسفیانہ یا صوفیانہ اصطلاحات کی مدد سے کی جانے والی تاویل۔ قرآن نجات کا محدود و مقید معنی میں قائل نہیں۔ اس کی تعلیم ہے کہ ہر انسان پیدائشی گنہگار و جہنمی نہیں بلکہ اپنی فطرتِ سلیم کے لحاظ سے معزز و معتبر ہے۔“ 11

جہاں تک عبدالماجد کی "سچی باتیں" کا تعلق ہے، وہ عبدالماجد کے افکار وخیالات و نظریات و میلانات کی اہم ترین نمائندہ کہی جاسکتی ہیں۔ ان میں ادبی، علمی، فقہی، کلامی، تہذیبی تمام قسم کے موضوعات آتے تھے اور عبدالماجد عام فہم مگر دل میں اُتر جانے والے پیرایے میں مسائل ومظاہر پر رائے زنی کرتے چلے جاتے تھے، خصوصیت کے ساتھ تہذیبِ مغرب کی بے اصلی، کم نگاہی، سطح بینی اور نام نہاد ترقی پر جو بیشتر کیمّتی ہے، عبدالماجد کا قلم بے حد رواں ہو جاتا تھا۔ وہ مغرب کے ساتھ مغرب ہی کے ہتھیاروں سے لڑتے تھے یعنی اہلِ مغرب ہی کے ہاں سے ایسے مصنفین وافراد چن لیتے تھے جنھوں نے مغرب کی اخلاقی، معاشرتی اور روحانی مفاسد کا ایک بے رحم سرجن کی طرح تجزیہ کرر کھا ہوتا تھا۔ یہ درست ہے کہ وہ مغرب کی بعض نارسائیوں اور برائیوں کو عام نظر کی بجائے محدب شیشے سے دیکھتے تھے لیکن اس کے پیچھے اصل میں ان کا تمام تر اصلاحی اوراخلاقی نقطۂ نظر کار فرما ہوتا تھا۔ اُنھیں اندیشہ یہ تھا(اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی رہے تھے) کہ کہیں مغرب کی یہ سراسر مادہ پرستانہ تہذیب مشرق کے فضائل کا گلانہ گھونٹ دے کیونکہ اثر ونفوذ کے اعتبار سے یہ تہذیبِ جدید ہر پرانی تہذیب سے زیادہ متاثر کن اور مہلک تھی۔ ایس۔ ایم۔ اکرام نے عبدالماجد کی تنقیدِ مغرب کے اس پہلو کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "معارف" اور "صدق" کو تہذیبِ مغرب کے مفاسد تو نظر آجاتے ہیں لیکن اُنھوں نے کبھی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر نہیں دیکھا۔ اُنھیں یہ نہیں سوجھتا کہ قدیم طبقے کی بھی اصلاح ہو۔ مختصر یہ کہ انھیں اپنے معاشرے کے مفاسد نظر نہیں آتے۔" ۱۰؎

اصل میں ایس ایم اکرام کا یہ اعتراض اس لیے ہے کہ انھیں کم از کم "صدق" کے وسیع مطالعے کا موقع نہیں ملا۔ ذیل میں عبدالماجد کی سچی باتوں سے ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جدید کی طرح قدیم پر بھی ان کی نظر تھی اور وہ خود احتسابی کے جذبے سے محروم ہر گز نہیں تھے۔ عبدالماجد اپنی عبرت اندوزی کے چراغ صرف مغرب ہی کی برق پاشیوں سے روشن نہیں کرتے بلکہ مشرق کی کبریت سے بھی جلاتے ہیں۔ 23/ مارچ 1946ء کی "سچی باتیں" کے مستقل عنوان کے تحت لکھنؤ کے کسی استاد کا یہ شعر؎

شفق گوں ہے ہوائے بامِ قاتل　　　کبوتر پر کبوتر گر رہے ہیں

درج کرنے کے بعد اس کے پُر تکلف، مبہم اور پیچ دار مفہوم کی وضاحت کرتے ہیں اور پھر لکھتے ہیں کہ ہمارے قدیم وکلاسیکی ادب کا بیشتر حصہ ایسے ہی بے مغزو بے مزا مبالغہ آرائیوں سے بھرا پڑا ہے اور دینی، اخلاقی تو خیر یہ کسی فطری جذبہ کی تسکین میں بھی ناکام رہا ہے اور اس میں الفاظ بدل بدل کر وہی فسق ومعصیت کی اور شہوانیت وابتذال کی باتیں ہیں۔ شذرے کے آخر میں لکھتے ہیں کہ:

> "نئے ادب اور نئی شاعری کی عریانیاں یقیناً لائقِ نفریں اور سزاوارِ ملامت، لیکن پرانے ادب اور پرانی شاعری کو صرف اس لیے بخش دیا جائے گا کہ وہ قدیم ہے۔ معیار ہمارے ہاتھ میں صرف عقل وشریعت کا ہے، اس پیمانے سے پرانے کو بھی ناپا جائے گا اور نئے کو بھی جانچا جائے گا۔" 11؎

کیا اس آخری جملے کی موجودگی میں عبدالماجد پر محض قدیم سے تقدس وابستہ کرنے کا الزام عائد کیا جاسکتا ہے؟

بہر حال ادبی وصحافتی اعتبار سے عبدالماجد کے یہ تینوں ہفتہ وار اعلیٰ درجے کے اخبارات میں شمار کئے جاتے ہیں اور ان کا درجہ تاریخِ ادب میں بلند اور امتیازی ہے۔

عبدالماجد کی صحافت میں بلکہ ان کی ہر تحریر میں جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے اور شخصیت میں تلاطم اور ہیجان پیدا کر دیتی ہے، وہ ان کا منفرد اسلوب ہے۔ وہ بیک وقت ایک حکیم، خطیب، جراح اور ہمدرد طبیب کی طرح مختلف حربوں سے کام لیتے ہیں مگر ان کا مقصودِ اصلی اور غایتِ اُولیٰ مریض کی شفا کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ اپنے اسلوب کی اس تاثیر میں وہ بعض اوقات اپنے اس خاص فن سے کام لیتے ہیں جسے "سرخی جمانے کا فن" کہتے ہیں۔ صحافت میں سرخی جمانے کی اہمیت مسلمہ ہے۔ قاری کے پورے وجود کو اپنی گرفت میں لے لینے اور اپنے موقف کو مختصر ترین لیکن ساتھ ہی ساتھ موثر ترین لفظوں میں قاری تک پہنچانے میں بنیادی رول اسی "سرخی" کا ہوتا ہے۔ عبدالماجد اس فن میں بڑے طاق تھے۔ اس ضمن میں وہ بعض اوقات برجستہ مصرعوں سے ایسا کام لیتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مصرعہ خاص اسی موقع کے لیے خلق کیا گیا تھا۔ شاہد احمد دہلوی کی وفات کے بعد جب ایک موقع پر "ساقی" میں ایک تبرّائی مضمون شائع ہوا تو عبدالماجد نے اس کا بھی نوٹس لیا۔ بعد ازاں اپنے ادارتی صفحہ پر اس ذیل میں بہت دلچسپ سرخی جمائی: "ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان وآگہی" اور یوں اس مصرعے کا اطلاق کمالِ مہارت سے رسالہ "ساقی" کے اس خاص شمارہ پر کر دیا۔ یا مثلاً ہندوستان میں اُردو کی بے بسی اور بدحالی کی طرف محض ایسا چلتا سا اشارہ کر دینا کہ، ہم بھی منہ میں "زبان" رکھتے ہیں، جس سے وہ خاص صورتِ حال ایجاز وایما اور لطف ولذت کی سرمایہ دار ہو جائے، عبدالماجد کا خاص فن تھا۔ ان کی چند اور سرخیاں دیکھئے، کیسی بولتی ہوئی ہیں:

> "اندر سبھا کی ایک جھلک"، "فتح سنگھ کی فتح"، "کاغذی سیکولرزم"، "قانون کی دھجیاں"، "تعصب کی یلغار"، "گئو بھگتوں سے"، "چھاگلازم"، "ایک سادہ چک"، "ایسے ویسے کیسے کیسے ہوگئے"، "خیر سگالی حج تک"، "تیز مرچ کی چائے"، "پرسنل لاء پر عقبی حملہ"، "پہاڑ کھودنے کے بعد"، "بڑوں کی ہاتھا پائی"، "بے خبری کا ریکارڈ"، "بھیڑیے پاسبان کے روپ میں"، "کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے"، "مصطفٰے نایاب وارزاں بولہب"، "سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں"، "اک کشمکشِ برق

وشر ردونوں طرف ہے۔"، "دونوں کو اک ادامیں رضامند کر گئی"، "ذکر حسین ذاکر حسین کی زبان سے"، "ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے"، "ماں کی برہنگی کا نظارہ"، "جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جدید خدمتِ "اسلام"، "جامۂ تہذیب کی عریانیاں"، "اقتدار کی دھوپ چھاؤں"، "پرچم آصفی کی رحلت"، "انٹر نیشنل نونہال"، "یہ سیکولر دیس"، "الٹی گنگا"، "آپس کی گالیاں ہیں غیروں کی تالیاں ہیں"، "ایک گندی کتاب"، "ایک خوش خبری جو خوش خبری نہیں" وغیرہ۔

عبدالماجد کی صحافت نگاری کی امتیازی خصوصیات کا خلاصہ یہ ہے:

۱) چھوٹے چھوٹے روزانہ کے واقعات سے عبرت وموعظت کے پہلو پیدا کرنا۔

۲) مہلک عوامل کا تعاقب کرنا۔

۳) مذاہبِ عالم کا تقابلی درس دینا۔

۴) جدید انکشافات، سائنس کی ایجادات سے قدیم طبقہ کو روشناس کرنا۔

۵) علوم جائزہ کی روشنی میں قرآنی پیام کی آفاقیت اور جانداری ثابت کرنا۔

۶) ولایتی اخبارات ورسائل اور مذہبی وعلمی کتابوں سے اخذ کردہ صحیح معلومات پڑھنے والوں کو فراہم کرنا۔

مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تقریباً باون برس کی طویل صحافتی زندگی عبدالماجد کا وہ طغرائے امتیاز تھی کہ تنہا یہی کوئی کم اعزاز نہیں۔ یعنی نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں، چہ جائیکہ اس صحافت کے ذریعے حسنِ انشا، فکرِ فرزانگی، حکمت ودانش، سوز وسرور اور جذب وجنوں کی کتنی ہی نئی حکایتیں رقم کی جاسکتی ہیں اور علم وادب کی بہترین خدمات انجام دی جاسکتی ہیں۔ عبدالماجد اپنی ادبی اور صحافتی تحریروں میں سادگی اور سلاست سے کام لیتے ہیں۔ ان کے نپے تلے، بجے چھوٹے چھوٹے جملے، برجستہ فقرے، محاورے، اشعار اور مصرعے، تراکیب بولتے ہوئے رواں دواں الفاظ۔ پھر الفاظ بھی کیسے کہ جو لفظ جہاں رکھ دیا ہٹائے نہیں ہٹ سکتا۔ انگشتری میں نگینہ کی طرح اپنی جگہ چمکتا ہے۔

حوالہ جات:

1۔ "معارف"، جون 1919ء، ص 621

2۔ حوالہ سابق، ص 622

3۔ حوالہ سابق مئی 1919ء، ص 563

4۔ دیکھیے "الناظر" جنوری 1924ء، ص 10

5۔ "سچی باتیں" (مقدمہ عبدالقدوس ہاشمی) ص۔ 135

6۔ "عبدالماجد دریابادی: حیات وخدمات" عبدالعلیم قدوائی، مطبوعہ صدق فاؤنڈیشن، لکھنؤ پہلا ایڈیشن 2009ء۔ ص 162

7۔ مضمون "ادبی معرکے" مشمولہ سہ ماہی "الزبیر"، ص ۶۴۳۔۶۷۳

8۔ "عبدالماجد دریابادی حیات وخدمات" از عبدالعلیم قدوائی، صدق فاؤنڈیشن، لکھنؤ 2009ء۔ ص ۵۴۱۔۶۴۱ نیز "خطوط ابوالکلام" مرتبہ مالک رام ص ۶۸۲

9۔ عبدالماجد دریابادی: "از مذہبِ من گبر ومسلمان گلہ دارد"، مشمولہ "صدقِ جدید" ۲/ جولائی 1965ء، ص ۷

10۔ تفصیل کے لیے دیکھئے ان کا مضمون "وحی ونجات" مشمولہ "صدقِ جدید"، ۱۲/ اکتوبر 1952ء، ص ۴

11۔ "صدقِ جدید"، ۳۲/ مارچ 1946ء، ص ۱

By

Dr. Ansari Masood Akhtar Jamal Ahmed

Asst. Professor & Head Dept. of Urdu

MSS's Ankushrao Tope College, Jalna (M.S.)

e-mail ID : nadvimasood@gmail.com

☆ ☆ ☆